OPEN ACCESS: Al Khadim Research Journal of Islamic Culture and Civilization
ISSN (ONLINE): 2710-0235 & ISSN (PRINT): 2710-0227
https://www.arjicc.com. DOI: 10.5281/zenodo.10082576

رجائیت اور اس کے اردو شاعری سے متعلقہ کام پر اثرات تجزیہ

An Analytical Study of the Impacts of Optimism on Urdu Poetry

Tayiba Anum
M.Phil Scholar Urdu, Ghazi Universty, D. G Khan
Email: balochanum686@gmail.com

Received on: 09-01-2022 Accepted on: 13-02-2023

Abstract

Optimism has its own characteristic in Urdu poetry and basically it reflects the positive aspects that poets use in their poetry to improve values. Various poets in their own style convey the message of changing social degradation and despair through determination and better thinking. They nurture the thinking of hope so that the social and moral values can be improved. As far as poetry and literature are concerned, seeing the bright side of things and events and having an optimistic view about the future is called optimism, and a person whose thoughts are optimistic is called optimism. Or he has some extraordinary power, he is formed by the environment or the environment is formed by his writing. Do they influence or not, if they influence it, how much is the real thing that gives life to literature?

Keywords: Poetry, Optimism, Urdu, Society, positive, etc.

رجائیت کیا ہے؟

انسانی جذبات کے ایسے مثبت رویے کو جو انسانی ذہن کو آرزو مندی، بلند حوصلگی اور بہتر کی جستجو کی طرف مائل کرے اور زندگی کو خوبصورت بنا کر پیش کرے، رجائیت کہلاتا ہے۔

لغوی مفہوم:-

رجائیت کے لیے فرہنگِ اصطلاحات میں انگریزی لفظ (Optimism)[۱] مستعمل ہے۔ نصیر ترابی شعریات میں رجائیت کا معنی "روشن پہلو" لکھتے ہیں۔[۲] صاحبِ جامع اللغات نے رجائیت کو عربی لفظ رَجا سے مشتق لکھا ہے، بمعنی امید، آس، دعا، منت۔[۳] اسی طرح صاحبِ فرہنگِ تلفظ نے "رجاء" بمعنی امید، آس، اچھی توقع رکھنا لکھا ہے جبکہ اس کی صفت رجائی قرار دی ہے۔[۴]

اصطلاحی مفہوم:-

رجائیت ایک ادبی اور تنقیدی اصطلاح ہے جو کسی شاعر یا ادیب کی زندگی سے جڑے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

"رجا عربی زبان میں امید کو کہتے ہیں۔ ادبی اصطلاح کے طور پر آرزو مندی، زندگی سے محبت اور پر امید لہجہ اختیار کرنا رجائیت کہلاتا ہے۔ شاعری میں خاص طور پر ایسے موضوعات اختیار کرنا جن سے عزم، حوصلہ اور امید کے جذبات پیدا ہوں، رجائیت ہے۔ رجائیت کی ضد

ہے۔اگر قنوطی دنیا کے متعلقات، واقعات، رشتوں اور علائق سے مایوس ہوتا ہے، تو رجائی شخص حیات سے متعلق پُرامید رہتا ہے اور ہر شے کے بارے میں خوش گمانی رکھتا ہے۔"۵ دراصل رجائیت قنوطیت کی ضد ہے۔رجائیت کے نقطہ ءنظر کے مطابق یہ دنیا مجموعی طور پر خیر اور مسرت پر مشتمل ہے۔ان دونوں اصطلاحوں کی درمیانی کڑی "میلارازم"(Melorism) ہے۔جس کی رو سے اپنی تمام تر خرابیوں اور شر کے باوجود دنیا اور زندگی ترقی کر رہی ہیں اور خیر کی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

رجائیت کی توضیح کے لیے چند نکات پیش ہیں:-

☆ رجائیت کے نظریے کی رو سے یہ دنیا تمام امکانی دنیاؤں سے خوش گوار ہے۔اگر کوئی اور دنیا ہوتی تو وہ اس سے زیادہ خوش کن نہ ہو پاتی۔

☆ رجائیت ایک خوش قیاس اور پرامید انسان کا نظریہ ہے۔جس کے نزدیک اس دنیا میں بہتر سے بہتر اشیا اور ماحول موجود ہے جو تھوڑی سی تگ ودو اور ڈٹے رہنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆ رجائیت یک ایسا نظریہ حیات ہے جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ دنیا مطلق خوشی، یک سر انبساط اور آزادی ہے۔

☆ جرمن فلسفی(لائبنز)کا نظریہ استحسان کہ اچھی سے اچھی دنیا پیدا کی جاسکتی تھی۔وہ ہماری دنیا ہے۔

☆ رجائیت: یہ عقیدہ کہ دنیا میں نیکی بدی پر غالب آجائے گی۔

☆ رجائیت:امید پروری، امید پرستی، خوش امیدی، طبیعت کا یہ رجحان کہ ہر معاملے کا انجام اچھا ہوگا۔

مندرجہ بالا توضیحی نکات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رجائیت ایک آرزو مند، رومان پرور انسان کے لیے ایک خوش کن جائے پناہ ہے۔

" جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے اشیا و واقعات کا روشن پہلو دیکھنا اور مستقبل کے بارے میں پر امید نقطہ ءنظر رکھنا رجائیت کہلاتا ہے اور ایسے شخص کو جس کے افکار میں رجائیت ہو رجائی کہا جاتا ہے"٦

رجائیت کو سماجی رویوں اور نفسیاتی اقدار کے زیرِاثر تقسیم کیا جاسکتا ہے، خیالی اور فعالؔ رجائیت جس میں عمل اور عمل کرنے کے اظہار کی قوت موجود ہو یا صرف خیالوں میں بہتری کی امید قائم رکھنا، یہ تمام پہلو رجائیت کے مضامین کی تفہیم کرتے ہے۔

"رجائیت دو طرح کی ہوتی ہے:ایک مجہول سی رجائیت جس میں عمل کی بجائے حالات کی کسی مساعد کروٹ کا انتظار ہوتا ہے۔دوسری وہ فعال رجائیت جو بہتر مستقبل کو وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہوتی ہے اور ضمنی ناکامیوں کے باوجود اپنی کامیابی پر یقین رکھتی ہے"ے

تاریخی پس منظر:-

رجائی شعرا اپنی آنکھوں میں حسنِ شش جہات لیے مسافری کے درد کا سامنا کرتے ہیں۔لیکن اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں رہتے ہیں۔ زمانے اور حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اُن کی منزلوں کی تلاش میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ہر درد اور دُکھ کا احساس اُن کے عزم و حوصلے کو مہمیز کرتا ہے۔زندگی جہاں کل کی نمائندگی کرتی ہے وہیں جزو کی نمائندہ بھی ہے۔اور اِس حقیقت کو شاعر نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ تسلیم

کرواتا بھی ہے۔اس کے برعکس اردو شاعری کی بیشتر فضا پر غم والم، شکستگی، قنوطیت اور افسردگی کے بادل اس طرح محیط ہیں کہ کہیں سے (بہ استثنائے چند گوشوں کے) کوئی شعاع امید پھوٹتی نظر نہیں آتی۔کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی میں غم نہیں لیکن ہمارے شعرا نے اسے زندگی کے لیے ناگزیر قرار دے دیا اور پھر "جہادِ زندگانی" میں بجائے اس کے کہ غم سے نبرد آزما ہوں ؛ غم کے سامنے سپر انداز ہو گئے لیکن رنج والم حیات افزا نہیں ہوتے ؛ اس لیے شعرا نے کنارِ محبوب اور میکدہ میں پناہ لی۔ دراصل شکست کے پہلو سے قطع نظر ہمارے شعرا نے اپنی پسپائی کو تسلیم کرنے کے بعد غم افزائی اور غم افشانی کو اپنا شعار بنالیا نہ صرف یہ کہ وہ جدوجہد اور سعی و عمل سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ غم کی کلمہ گوئی شروع کر دی اور ایک ایسا نظریہ حیات اختیار کر لیا جو مشتمل تھا سینہ کوبی، ماتم گساری، قنوط انگیزی اور لطفِ غم یعنی غم کے زخموں اور خراشوں کو کریدنا، خون کی چھینٹیں اڑانا اور اس سے لطف اندوز ہونا۔یہ غم پسندی کچھ اس درجہ بڑھی کہ غم کا مداوا بھی غم ہی کو بتایا گیا۔ غرض ہر طرف گریہ وزاری، آہ و نالہ سے صفِ ماتم بچھ گئی۔امید ورجا کی کوئی شعاع باقی نہیں۔سچ تو یہ ہے کہ صوفیانہ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ اور ترکِ مولیٰ نے ہمارے شعرا کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔دنیا ان کی نظر میں محض "دام خیال"، "مایہ جال" اور چڑیا رین بسیرا "زندگی آنی جانی اور فانی ہے، اس لیے اسے بہتر بنانے سے فائدہ؟ دراصل ادیب عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے یا کوئی غیر معمولی طاقت اس کے پاس ہوتی ہے ،وہ ماحول سے بنتا ہے یا ماحول اس کی تحریر سے بنتا ہے ادیب اور ماحول میں کیا تعلق ہے، اجتماعی زندگی، سماجی روایات، معاشی حالات، فلسفہ، مذہب اور رسم ورواج اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ نہیں، اگر اسے متاثر کرتے ہیں تو کس قدر اصل چیز جس سے ادب میں زندگی پیدا ہوتی ہے کیا ہے؟

رجائیت کا رجحان:-

اس صورت حال کے برعکس جب اردو کے جدید شعرا کی شاعری کا جائزہ لیا جائے اور اس میں زندگی کی خوبصورتی ورعنائی کی جستجو کی جائے تو غمِ جاناں و غمِ دوراں کا امتزاج رومانویت اور رجائیت کی ہم آہنگی سے مزید دلکش نظر آتا ہے۔ان کی آواز میں زندگی کی امنگوں اور امیدوں کے ساتھ ساتھ جذباتی خوبصورتی کے عناصر بھی موجود ہیں جو قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ رجائیت کی مصفا قوت کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت ٹھہر نہیں سکتی۔اس کا وصفِ اولیں یہ ہے کہ اپنی سچائی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو بے معنی کر دیتا ہے۔ عشق روح کی آزادی کا معاملہ ہے جو اپنے وجود کے ساتھ ہی فرد کو ہر قسم کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرتا ہے تاکہ روح کا پرندہ امکانات کی بے کنار وسعتوں میں پرواز کر سکے۔اس میں سرِ فہرست پیغمبر، صوفی، مفکر، فنکار، ادیب، اور دکھی انسانیت کو گلے لگانے والے شامل ہیں۔یہ سب لوگ انسانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ معاشرتی تاریخ کی ابتدا سے ہی معاشرہ کے فرمانروا ایک طرف تو عوام کو روزمرہ کے مسائل میں الجھائے رکھتے ہیں۔اس طرح سیاست کو مذہب، اور اخلاقیات کا لبادہ پہنا کر روایت کے معبد میں رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ نسل در نسل ان بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور اپنے عقل و شعور اور روحانی آزادی کو ان بتوں کی نذر کر دیتے ہیں۔اس فرمانبرداری کے نتیجے جو انعامات عوام کو ملتے ہیں ان میں سرِ فہرست معاشرے کی طرف سے دی جانے والی فرد کی پہچان ہے۔ پہچان

کا یہ معاملہ معاشرے نے رنگ، نسل، مذہب، قومیت اور زبان وغیرہ کے حوالے سے طے کیا ہے۔ یہ حوالے بظاہر بے ضرر نظر آتے ہیں لیکن ان کے ذریعے انسان کے شعور کی حد بندی کر دی گئی ہے اور یہ حدود انسان کو انسان سے جُدا رکھتی ہیں اور اسے ایکتائی کا تجربہ نہیں کرنے دیتیں۔ کیونکہ اگر یہ شعور بیدار ہو جائے کہ قدرت نے انسان کی سب سے بڑی پہچان صرف اور صرف اس کے انسان ہونے میں رکھ دی ہے اور یہ وہی پہچان ہے جو باقی تمام مخلوقات کو بھی عطا ہوئی ہے اور وہ بغیر کسی ابہام کے پہچانے جاتے ہیں تو عوام ایک واحد قوت میں ڈھل جائیں گے جس کا رخ ایک مخصوص طبقے کی سیاست کے مطابق بدلا نہ جا سکے گا۔ اہلِ اقتدار عوام کو تحفظ کے نام پر دیتے ہیں۔ زندگی کی نا استواری اور موت انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ نامعلوم کا خوف نے انسان کو ازل سے لافانی اور لامحدود قوت کی پناہ تلاش کرنے پر مجبور کیا ہے اور یہی خوف بیشمار نفسیاتی مسائل کا ذمہ دار ہے۔ اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اہلِ اقتدار کا پسندیدہ معاشرتی نظام مخصوص طریق کار کا پلندہ صداقتِ کامل اور حرفِ آخر کا لیبل لگا کر انسان کی پیدائش کے وقت ہی اس کے ساتھ نتھی کر دیتا ہے اور اس طلسم کا شکار فرد اس شرمندگی کا بوجھ اٹھائے جہانِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے کہ افسوس وہ دیئے گئے نقشہ پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو سکا۔ اسی لئے تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی پیغمبر، فلسفی، مفکر، فنکار یا سچے اہلِ قلم کا سفر آسان نہیں رہا۔ لیکن یہ سخت جان زخم کھا کر بھی اپنے لہو سے انسانی شعور کی آبیاری کرنے سے باز نہیں آتے اور کبھی کبھی انسانی تاریخ پر اپنا نقش چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کی روشنی لوگوں کو نئے راستے پر گامزن کرتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ معاشرتی عمل کہ جس کی بنیاد طاقت پر ہے جس کا منطقی نتیجہ ہوس ہے آہستہ، آہستہ اس نئے راستے کو بھی روایت کے سانچوں میں ڈھالنے لگتا ہے۔ یوں اپنے وقت کا روایت شکن وقت گزرنے کے ساتھ روایت ساز بن جاتا ہے۔ اختر عثمان کی فکر کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھا جائے کہ اختر نے ماڈرنیٹی کے ضمن میں جو موقف اختیار کیا وہ اسی تناظر میں انھیں سوجھا اور اسی تناظر میں وہ موزوں ہے۔ حقیقتاً ماڈرنیٹی اور ماڈرنائزیشن تمام غیر مغربی اقوام اور بالخصوص اسلامی ممالک کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کا مستقل اور ہر سطح پر قابلِ قبول حل اب تک پیش نہیں ہو سکا۔ اور مختلف ممالک میں جو حل تجویز کیے گئے ہیں وہ ان ممالک کے سماجی تاریخی تناظر کے زائیدہ ہیں۔ نیز ایک ہی ملک میں مختلف اوقات میں مختلف حل سامنے آئے ہیں۔ مثلاً ترکی اور مصر میں ابتدا میں ماڈرنائزیشن سے مراد مغرب کی عسکری ٹیکنیک کا حصول تھا۔ اور ہندوستان میں ابتداً ماڈرنائزیشن کا مطلب جدید مغربی انگریزی تعلیم سے بہرہ مند ہونا تھا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محکوم ممالک میں ماڈرنائزیشن بڑی حد تک ویسٹرنائزیشن کے مترادف سمجھی گئی ہے۔ اس لیے کہ مغرب نے غیر مغربی اقوام کو اپنی تہذیب کے جس پہلو سے زیادہ متاثر یا مغلوب کیا وہی پہلو محکوموں کا آدرش بنا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام اقوام نے ماڈرنیٹی کا بالعموم سطحی تصور قائم کیا ہے۔ انھوں نے ماڈرنیٹی کو اس کے ہمہ گیر تناظر میں نہیں دیکھا، اس پراسس کو سمجھنے کی سعی نہیں کی، جس نے ماڈرنیٹی کو ممکن بنایا۔ ٹیکنالوجی یا علوم تو ماڈرنیٹی کے آئس برگ کا وہ معمولی سا حصہ ہیں جو سمندری پانی سے باہر ہوتا ہے۔ ماڈرنیٹی کے پورے پراسس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بیشتر مسلم ممالک میں ماڈرنیٹی ممکن نہیں ہوئی۔ ہر چند اختر عثمان کی شاعری میں معاشی سماجی عوامل کا ذکر ملتا۔ اختر عثمان نے مذہب، سائنس یا عقل و وجدان کے ضمن میں شاعری کی۔

شاعر نہ فلسفی ہوتا ہے اور نہ نظریہ ساز۔ شاعری دنیا، عام علوم یا انسانی تجربوں یا اقدار کے بارے میں وہ باضابطہ مواد بھی فراہم نہیں کرتی جو فلسفے یا سماجی علوم سے حاصل کیا جاتا ہے، کیونکہ شاعری اساسی طور پر اس استدلال سے عاری ہوتی ہے جس کے بغیر کسی فلسفیانہ اور علمی تصور کو ثبات نہیں ملتا۔ شاعری کسی مخصوص انسانی صورتِ حال کے بارے میں بتاتی نہیں بلکہ اس کا انکشاف کرتی ہے، اور اس طرح معنی کے ایک انوکھے نقش کو منور کرتی ہے۔

ہر شاعر کی شاعری اس کے زمانے کے ایک خاص نقطۂ فکر کو اجاگر کرتی ہے، جو اس اعتبار سے غلط نہیں کہ اُس میں یقیناً ایک مربوط نظامِ فکر ہے۔ ان کی شاعری ایک خاص نظامِ فکر کی توسیع نمایاں ہے تو یہاں بعض سوالات نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا شاعری میں نظامِ فکر کا ہونا ضروری ہے؟ یا پھر یہ سوال کہ وہ نظامِ فکر حیات و کائنات کے کس شعبے سے متعلق ہو جس کی بنیاد پر کوئی شاعری اپنے تخلیقی مدارج طے کر کے پایۂ عظمت تک پہنچ سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعری کا فکر سے رشتہ ہے لیکن یہ رشتہ اُس وقت تک گہرا نہیں ہو سکتا جب تک کہ فکر اشیاء سے مربوط ہو کر تخیل کی سطح پر انکشاف کرنے کی حامل نہ بن جائے۔ شاعری میں انکشاف کی یہ سطح اتنی واضح ہوتی ہے کہ اس پر انسانی تجربے، مشاہدے یا جذبے کا گمان یقین کی حد تک ممکن ہوتا نظر آتا ہے۔ شاعری میں اس قسم کی فکری شمولیت کی باقاعدہ ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔ اس لیے غالب کی شاعری کا ایک بڑا اور توانا حصہ اُن اشعار پر مشتمل ہے جن میں فکر پہلے تو اشیاء میں منتقل ہوتی ہے اور پھر اشیاء تخیلی سطح پر انکشاف کا ذریعہ بنتی ہیں۔

غالب کی شاعری میں انکشافی سطح پر کسی کاہن یا جوگی کا سا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ کوئی شاعری جب اس قسم کا کام انجام دینے کی اہل ہو جاتی ہے تو وہ اُن اقدار سے بھی مزین ہو جاتی ہے جن کا براہِ راست تعلق فن کے عالم سے ہوتا ہے، اور پھر یہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس کا نظامِ فکر حیات و کائنات کے کس شعبے سے متعلق ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس نوع کا شعری وظیفہ کسی فکر یا فلسفے کو تخلیقی تقلب کے بعد اسے راہبانہ انکشاف کا اہل بنا دیتا ہے جو بجائے خود اپنی فنی قدروں کا موجد بھی ہوتا ہے اور محافظ بھی۔ غالب کے بعد اقبال اردو کے واحد بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری انکشاف سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں انکشاف کا دائرہ اس لیے اتنا وسیع ہے کہ اس میں فلسفہ اپنی تمام تر تقلیبی منزلوں کو طے کر کے جذبے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

"دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقدیر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں

دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو" 11ے

اگر اقبال کی شاعری کے فلسفیانہ نظام پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو اس حقیقت تک پہنچنا دشوار نہیں کہ ان کے یہاں وہی فلسفے کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئے ہیں جن میں تحرک کی قوت موجود ہے۔ مولانا روم کی مثنوی ہو یا مجدد الف ثانی کا شہودی فلسفہ... نطشے کا فوق البشر ہو یا برگساں کا تصورِ وقت... ان سب کی مشترک صفت تحرک ہے۔ اگر صرف فلسفے سے شغف ہی اقبال کی بنیادی جبلت ٹھہرتا تو ان کے یہاں ان فلسفیوں کی نشان دہی بھی ضرور ہوتی جن کا فلسفہ یاس و قنوطیت سے عبارت رہا ہے۔ اسی طرح راشد کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ راشد کی دلچسپی مشرق وسطی کی زندگی اور وہاں کے مسائل گہری رہی ہے، اور ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی پس منظر سے مربوط ہے۔

"لامحالہ ادبیات میں نئے اصنافِ سخن کا رائج کرنا بنفسہٖ کوئی شاندار کارنامہ نہیں اور کبھی کسی ادیب کو یہ امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ قابل فخر بات تو صرف یہ ہے کہ اولاً خیالات اور افکار میں اجتہاد ہو پھر نئے خیالات اور افکار اسلوبِ بیان کے ساتھ اس قدر مکمل طور پر ہم آہنگ ہو ں کہ اس ہم آہنگی سے ادیب کی انفرادیت آشکار ہو سکے۔ "12ے

راشد کے شاعری کو دیکھا جائے تو اس میں جو بات الگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک نئے مزاج کی شاعری ہے۔ جس میں راشد نے شاعری کو نئی جہت بخشی ہے انہوں نے سب سے شعراء سے ہٹ کر اپنی شاعری میں ایک نئے فلسفے کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ 13

رجائیت میں اہم بات یہ ہے کہ شعراء زمانہ نے اپنے کام میں ایک ہی نظریہ کے برعکس نئے اصولوں کو جنم دیا اور روایات کو جدت سے نوازا۔ اس سے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ روایات وجدت اور حقائق کے ساتھ رومانویت کے سانچے میں ڈھالا۔ جو ایک نیا اور یکسر منفرد سبق ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔

" حسن کی ضو پھوٹتی پو، لفظ کی لو، ڈھب کا نشہ

یاد کی تب، وصل کی چھب، پھول کی لب، شب کا نشہ

گن کی غنا، در کی ضیا، سر کی صدا، گر کی ادا

فن کا شرف، دل کا صدف، روح کا دف سب کا نشہ "14ے

بیسویں صدی اپنا سفر ختم کرتی ہے تو نئی صدی کلون، ربورٹ، انٹرنیٹ اور نہ جانے کتنے موضوعات ہماری شاعری کا حصہ بن گئے۔ اکیسویں صدی کے اردو شعری ادب کا جائزہ رجائی حوالے سے لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نئی شاعری میں حالیہ سماج کی ایک سے ایک دلخراش تصویریں ہیں اگر ایک طرف خوف اور دھوئیں کا حبس ہے تو دوسری جانب روایتی طور پر سہی حسن وجمال اور امید افزا خیالات کی شبنمی ٹھنڈک ہے ۔ حسن و عشق کے روایتی اذکار کے ساتھ ساتھ مختلف پیرایہء اظہار کے ساتھ اس لیے نئے دور کی تمام اشیا کے ساتھ عشق اور امنگیں بھی نئی اور

ان کا انداز بھی نیا، جمالیات کا تصور بہر حال اقتصادیات اور معاشیات سے براہِ راست وابستہ رہتا ہے اور تاریخ و جغرافیہ سے بھی ایسی ہنگامیت میں قلب اور وارداتِ قلب کا ذکر طرح طرح سے کیا گیا ہے۔اس دورِ جدید کے شعرا کے یہاں اپنے کرب والم، درد و ستم، تنہائی و ویرانی ،لاچاری اور بے بسی، حبس اور گھٹن کے باوجود نئی شاعری میں احتجاج کی گونج بہت مدھم ہے۔۔وہ حسی اور جذباتی نشیب وفراز سے پر زندگیجو ہمارے پیش روؤں کو ورثے میں ملی تھی ہمارے لیے شاید قصہ ءپارینہ بن گئی یہی وجہ ہے کہ آج کے شعرا کی شاعری میں رجائیت کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔

تیزی سے بدلتے ہوئے عہد کی یہ شاعری زیادہ عمدگی، پائداری،اور آفاقیت پر مبنی ہوگی۔کیونکہ نئی صدی کی یہ شاعری اپنے زمانے اور عہد کے تمام مسائل کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہے اور ان مسائل کے حل سے بھی بہت خوب واقف ہوگی،یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں ایک نئے انداز کی رجایئت موجود ہوگی جو ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور تدبیر بھی عطا کرے گی۔زبان کا بحران، شکصیت اور شناخت کا بحران نئی شاعری کے لیے یہ سب مسئلے پرانے پڑ چکے ہیں۔ نئی شاعری نئے جادوئی رابطوں اور نئی شعری وحدت خلق کرے گی۔

اکیسویں صدی میں سماج جس تیزی کے ساتھ کروٹ لے رہا ہے، سیاسی اور سماجی بحران کے شکار سماج کے اقدار بھی اسی طرح تبدیل ہو رہے تھے، نتیجتاً ادبی سطح پر جو موضوعاتی اور ہیئتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں،ان حالات میں ایک طرف جہاں انقلابی رجحان پروان چڑھ رہا ہے وہیں دوسری طرف انحطاطی رویے نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں۔انقلابی رجحان یا انقلابی بحران کا آفتاب جہاں ادبی افق پر طلوع ہو چکا ہے وہیں مؤخر الذکر رجحان بھی اس کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھ رہا ہے۔

ادب کے کئی رنگ نظر آتے ہیں جس میں ایک طرف عصر حاضر کے تقاضوں کے ترجمان ترقی پسند ادبی تحریک ہے جو ادب کو سماج کے تابع قرار دیتی ہے، خارجیت اور مادی حالات کو بنیاد مانتی ہے جو عوامی زندگی اور اس کی کشمکش سے اپنے موضوعات اخذ کرتی ہے وہیں دوسرا رجحان جو بالکل اس کے شانہ بشانہ چلتا ہے وہ اس کے بالکل برعکس مواد اور معنویت کے بجائے اسلوب اور ہیئت پر زور دیتا ہے،داخلیت کا پرستار ہے اور ادب اور ادیب کی سماجی ذمہ داریوں کا منکر ہے۔جسے ''حلقہ ارباب ذوق'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کے بعد ''جدیدیت'' وجود میں آتی ہے جو پیرایہ بیان کے ساتھ ہی پیرایہ خیال کو بھی اہمیت دیتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں بھی شدت آتی ہے اور ادب کی ادبیت معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔جس کے نتیجہ میں یہ رجحان بھی ماند پڑتا ہے اور ادب کو ایک نئے زاویہ سے پرکھنے کا سراغ ملتا ہے۔جس میں قدیم اور جدید کلاسیکی وغیر کلاسیکی، ترقی پسند وغیر ترقی پسند تمام رجحانوں کے صالح اقدار کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی گئی۔جسے ''مابعد جدیدیت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس بارے میں سعید احمد نے اپنے تحقیقی مقالے ''جدید اردو نظم مغربی افکار کے تناظر میں'' میں یوں رقم طراز ہیں:

'' معاصر جدید اردو نظم کے حوالے سے دیکھیں تو مابعد جدیدیت کے ابتدائی مظاہر کی تعین وشناخت بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی جاسکتی ہے۔یہ وہ دور ہے جب جدیدیت اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئی تھی۔اور اسے تاریخی تغیّر کے اصول کے تحت یا تو زوال کا سامنا تھا یا اپنی اثر

انگیزی کو قائم رکھنے کے لیے توسیع وتقلیب کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ اس تاریخی موڑ پر جدید اردو نظم اپنی توسیع وتقلیب کے عمل سے گزرتی ہوئی جدیدیت سے مابعد جدید عہد میں داخل ہو گئی۔"15ے

ڈاکٹر منصور خوشتر لکھتے ہیں:

"جیالے لوگ ٹوٹتے نہیں، ڈٹ کر سامنا کرتے ہیں۔ جھکنا ان کا شیوہ نہیں وہ بر سرِ پیکار ہونا پسند کرتے ہیں۔ طنطنہ کے شاعروں کا کیسا سرکش ،کٹھور اور البیلا لہجہ ہے حوصلہ شکن حالات میں بھی بعض شاعر مایوس نہیں ہوتے، وہ سوال کھڑا کرنے، جواں مردی کا مظاہرہ کرنے اور بقا کی جنگ جیتنے کا سجھاؤ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور یہی ان کے ضمیر کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ چند اشعار جن مین کتنے نرم لہجے میں جگانے، ہمت دلانے، آرزو جگانے کی ترغیب دی گئی ہے:

یہی بہت ہے ملا خاک میں نہ عزمِ سفر
سرائے دور، کہیں راہ میں کنواں بھی نہیں
(خالد عبادی)

روند کے آگے نکلنا ہو گا
رہاہ میں کوئی پڑا ہے تو ہے
(شمیم قاسمی)

سناٹوں میں شور مچایا کرتا ہوں
سوئے ہوئے رستوں کو جگایا کرتا ہوں
(جمال اویسی)"16ے

خلاصہ

اس صدی کی پہلی دہائی ہی سے شاعری نے زمین پر قدم جماتے ہوئے نئے فکری افق اور اسلوبیاتی شفق کی جستجو کی ہے۔ حوصلہ شکن حالات سے ٹوٹ کر بکھرنے اور مایوسی کا دامن تھامنے سے گریز کیا ہے۔ کبھی خود کو سمیٹ کر اپنی اپنی سمتیں متعین کی ہیں اور خوشگوار ہواؤں میں اڑان بھری ہے ان کے ہاں نہ صرف مقامی، وطنی اور عالمی معاملات و مسائل کی دھمک ہے بلکہ ان کا خوشگوار ادراک بھی ہے اور بعض جگہ معاملہ فہمی مین ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بھی شامل ہے۔

References

1-Akhtar Usman, Sitara Saaz, Rawalpindi, 2019, P.77
2-Aqeel Sadiqi, Jadeed Urdu Nazam, Multan, 2014, P.23
3-Sarwar Javed, Urdu Nazam ki Azeem Riwayat, Karachi, 2014, P.14.
4- Akhtar Usman, Sitara Saaz, Rawalpindi, 2019, P.79
5- Sarwar Javed, Urdu Nazam ki Azeem Riwayat, Karachi, 2014, P.19

6- Aqeel Sadiqi, Jadeed Urdu Nazam, Multan, 2014, P.43
7- Sarwar Javed, Urdu Nazam ki Azeem Riwayat, Karachi, 2014, P.49
8-Ibid , P.172
9- Aqeel Sadiqi, Jadeed Urdu Nazam, Multan, 2014, P.316
10-Akhtar Usman, Sitara Saaz, P.126-27
11-Iqbal, Kuliyat, 1997, P.29
12-Rashid, Mawara, Lahore, 1994, P.30
13-Ibid, P.86
14- Akhtar Usman, Sitara Saaz, P.76
15-Saeed .A., Jadeed Urdu Nazam Magharbi Afkar, Islamabad, 2008, P.280.
16- Khushtar Mansoor, Urdu Ghazal, New Dlhi, 2017, P.79.